مجالسِ عزا اور فرائض عزاداری

خطیب اکبر لسان الشعراء مولانا سید اولاد حسین شاعرؔ اجتہادی

اس برصغیر میں عزاداری نے معنوی اعتبار سے صرف ترقی ہی نہیں کی بلکہ اس سرزمین نے عزاداری کو اپنا لیا اس میں ابتداً تو انداز بیان تقلیدی رہا۔ لیکن بعد میں تقلید میں بھی ترمیم کی گئی، وہ صنف بالکل ہی جدا ہوگئی۔

کہتے ہیں کہ مرثیہ کا آغاز شہادت ہابیل اور مرثیہ حضرت آدم سے ہوا۔ اور مرثیہ گوئی کا پہلا شرف زبان سُریانی کو حاصل ہوا ہے۔ یعرب بن قحطان نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔

اس بیان سے کم از کم مرثیہ کی قدامت پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ مطابقت بھی تعجب خیز ہے کہ سریانی کے بعد دوسری زبان جس کا آغاز مرثیہ سے ہوتا ہے وہ ہماری اردو ہے اور عرب کے بادشاہ یعرب بن قحطان کی جگہ دکن کے بادشاہ قطب شاہ اس کے موجد ہیں۔

ملک میں مدتوں یہ خیال چکّر لگاتا رہا ہے کہ اکبر کے اُردوئے معلیّٰ (چھاؤنی) کے مختلف الالسنہ سپاہیوں کے میل جول نے اردو کی تازہ زبان پیدا کی، جو اپنی تعلیم وافہام ہیں سب کے لئے یکسانیت رکھتی ہے۔ مگر ہم کو حیرت ہوتی ہے جب ہم گذشتہ دو عظیم الشان لڑائیوں میں مغرب ومشرق جنوب وشمال کے ہر ملک اور ہر زبان بولنے والوں کو یکجا دیکھتے ہیں، اور یہ مختلف زبانیں بولنے والے پانچ پانچ چھ چھ برس تک یکجا رہنے اور آپس میں اظہار مطلب کرنے پر مجبور بھی ہوتے ہیں، مگر کسی نئی زبان کی ایجاد نہیں ہوتی۔

ہاں مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ جو اَن پڑھ ہندوستانی یہاں سے جاتے ہیں، وہ انگریزی کے مجروح ٹوٹے پھوٹے الفاظ یاد کر کے واپس ہوتے ہیں۔

ہم کو اردو کی ابتداء کے بعد اس کے ارتقائی نقطہ پر پہنچنے میں بھی غزل یا مثنوی یا قصیدے یا اور کوئی صنف ایسی نظر نہیں آتی جو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابل میں لا سکے۔

بقول مولانا شبلی اگر انیسؔ کے مرثیے نہ ہوتے تو اردو دوسری زبانوں کے مقابل نہ ہوتی۔

یعنی اردو کی ابتداء اور انتہا مرثیہ ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے، تو ہم کو سوچنا پڑے گا کہ اردو لشکر کی تخلیق ہے یا عزاداری کی تبلیغی ضرورت نے اس زبان کی ایجاد کی۔

یہ بحث بہت طویل ہوگی اگر ہم یہ ثابت کریں کہ اردو صرف عزاداری حسینؑ کی تخلیقی طاقت کا کرشمہ ہے، کیونکہ اس زبان میں اس کے مصطلحات ہیں، اس کے محاورات میں ایسے امثلہ، ایسے اسماء موجود ہیں جو شیعہ زبان کے سوا دوسرے کے منہ پر کھپ نہیں سکتیں (سکتے)۔

ہم کو زبان اردو کے متعلق اتنا ہی کہنا ہے کہ جتنا اس کا تعلق عزاداری سے ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو شعراء ۹۹ فیصد شیعہ تھے۔ آپ کی نظر انتخاب جس کو بھی چنے گی وہ شیعہ ہی ہوگا۔

میر تقی میرؔ، مرزا سوداؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ، خواجہ میر دردؔ، مصحفیؔ، اسیرؔ، ناسخؔ، آتشؔ اور وزیرؔ، صباؔ، رندؔ نظیر اکبرآبادی۔ یہ سب شیعہ تھے، اور ہر شیعہ غزل گو نے مرثیہ یا نوحہ ضرور کہا ہے۔

سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے کلیات ملاحظہ ہوں، اس طرح اردو کا وسطی دَور بھی مرثیے سے لبریز نظر آئے گا۔ غالبؔ مرحوم منصف مزاج تھے، انھوں نے میر انیسؔ کے مقابل اپنی شکست کو ضمیر کی فتح سمجھ کر، چند بند کہہ کر پھاڑ ڈالے مگر مرثیہ ضرور کہا۔ اس طرح زبان اردو کا ہر دور مرثیے کے لئے باضابطہ طور پر وقف رہا۔

جس کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو مرثیہ ہی کے لئے

پیدا کی گئی تھی۔ اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ عزاداری کے رواج میں ایرانیوں نے زبردست حصہ لیا ہے۔ اور ایرانی یوں تو تیمور اور بابرؔ کے عہد سے ہندوستان پر مسلط تھے، مگر ان کا بڑا جماؤ دکن کے شیعہ بادشاہوں کے درباروں میں رہا۔ اور اردو بھی دکن ہی میں پیدا ہوئی اس لئے اردو کے آغاز میں ایسے مرکب اسماء زیادہ ملتے ہیں جن میں عربی، فارسی کی بیرونی آمیزش ہے۔ مثلاً عاشورخانہ کا سمجھنا ایک ہندی کے لئے آسان نہ تھا۔ اس لئے اس کو اردو بنانا پڑا۔ اور رفتہ رفتہ عاشورخانہ امام باڑہ ہوگیا۔

فطری جرأت وشجاعت کو سمجھانے کے لئے دکن میں تصاویر تک سے کام لیا گیا ہے۔ آپ جس دیوار پر شیر کی تصویر بنی ہوئی دیکھیں، سمجھ لیں کہ اس کا تعلق عاشورخانے سے ہے یعنی ایک ایرانی مبلغ مافی الضمیر کو ملکی اصحاب کے ذہن نشین کرنے کے لئے بے تاب نظر آتا ہے۔ اور آخری صورت یہ ہوئی کہ کچھ اپنے الفاظ دے کر کچھ مقامی الفاظ لئے۔ اور ان سب نے مل کر اردو کی صورت اختیار کی۔

اردو نے فارسی یا عربی سے مرثیے کا چلن تو لیا مگر عہد بہ عہد اس میں اتنے اضافے کئے گئے کہ اب مرثیے کو خاص اردو ادب کی صنف کہا جائے۔

مبلغین عزاداری نے کمال کیا ہے کہ اپنی تبلیغ میں ہر وہ راستہ اختیار کیا ہے جو مذاق ملک نے دلوں تک سیدھا پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے اس تبلیغ میں کہیں کہیں شریعت سے بھی تجاوز کیا اور علماء نے اصل مقصد کی برتری وضرورت کو محسوس کرتے ہوئے غض بصر سے کام لیا۔

انہیں مبلغین نے باجوں پر قبضہ کیا۔ یہاں تک کہ شادی کے باجوں سے ماتمی باجوں کے ٹکڑے الگ کر دیئے۔ ماتمی نقاروں کی آواز میں آپ ادنیٰ سی توجہ میں امتیاز کرلیں گے۔ سوال جواز اور عدم جواز کا نہیں، یہ دیکھنا ہے کہ جاہلوں میں اور خصوصاً دیہاتوں نے جہاں الف نے اپنی شمع نہ دکھائی تھی، اور ب نے اپنا دیپک نہ جلایا تھا، نام حسینؑ کیونکر پہنچا دیا۔؟ یقیناً اردو اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھی، جب باجوں سے عزاداروں کو اور عوام کو عزاداری کی طرف متوجہ کیا جاتا تھا۔ اور اسی اظہار واقعہ کے لئے عزاداری میں لڑائی کے کرتب شریک کئے گئے جس پر محرم کے سپاہیوں کا نعرہ یاحسینؑ شاہد ہے۔

جب اردو پیدا ہوئی تو اس میں دو مصرعوں کے ہلکے نوحے نظم کئے گئے۔ ان میں مذہب کے خصوصی مسائل سے کنارہ کشی اختیار کی گئی۔

صرف مظلومیت ہی مظلومیت تھی، تبلیغ میں ترویج بھی تھی۔ عزاداری کو مناظرے سے بچا کر خویش ودرویش دونوں کو ساتھ لینا تھا۔

جب نوحے مجالس میں مقبول ہو چکے تو نظامیؔ وغیرہ کے انداز سے سلام کی صنف پیدا کی گئی، جو نوحے کی طرح خاص مضامین سے خالی نہ تھی، آغاز میں سلامی اور مجرئی کے الفاظ ملا کر اس کو معتقدین کے تقلیدی لباس میں رکھا گیا۔ مگر اب یہ صنف بے نقاب ہو چکی ہے۔ اور بغیر سلامی اور مجرئی کے ہر قسم کے مضامین جو مذہبی ہوتے ہیں پائے جاتے ہیں۔

سلام اور نوحے میں حقیقی فرق وامتیاز ہے۔ مرثیہ بھی ابتداء میں مسدس پر منحصر (نہ) تھا۔ میر مظفر حسین صاحب ضمیرؔ نے اس کو نہ صرف مسدس کیا بلکہ اس کے سارے حدود مقرر کر دیئے۔ جن کو مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ نے انتہائی نقطے تک ترقی دی۔

پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ مرحوم نے اپنا زور طبع صرف دو بحروں تک محدود رکھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انھوں نے مجتث یا رمل میں نہیں کہا مگر حق یہ ہے کہ ان آخری بحروں کو میر نفیسؔ خلف میر انیسؔ ومرزا اوجؔ خلف مرزا دبیرؔ مرحوم نے مرثیے میں داخل کیا۔

ان دونوں بزرگوں کا زیادہ تر کلام آخر الذکر بحروں میں ہے جب کہ مرزا دبیرؔ میر انیسؔ مرحوم کا زیادہ حصہ کلام اور مشہور مراثی مضارع یا ہزج میں ہیں:

۞ جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

۞ جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا

۞ جب نوجواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا
۞ جب حُر کو ملا خلعتِ پر خون شہادت
۞ کنعانِ محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے

آپ نے غور نہیں فرمایا۔ ان بحروں کے اضافے (نے) اور اس فن کو ترقی دی۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا دبیرؔ مرحوم کا طرز ادا بہت سادہ تھا، جب کہ میر انیسؔ کا پڑھنا ایک ٹھاٹ رکھتا تھا۔

مرثیے کا یہ وہ وقت تھا۔ جب صرف کلام ہی نہیں انداز وادا سے بھی اس کو پر تاثیر اور بلند کیا جارہا تھا۔

میر انیسؔ صاحب مرحوم اور شاید ان سے بھی پہلے پڑھنے کا انداز پیدا ہو چکا تھا۔ مگر اس میں اتنی متانت اتنی سنجیدگی تھی کہ آخر کار اس کو خواندگی کا انداز کہا گیا۔

میر انیسؔ مرحوم ایک مجلس میں رونق افروز تھے اور آپ کی اولاد میں ایک بزرگ پڑھ رہے تھے۔

وہ اٹھا پردۂ در اور وہ حسینؑ آئے

پڑھنے والے نے ایک ہاتھ پھیلا کر اور کلمہ کی انگلی کو متحرک کرتے ہوئے وہ کا اشارہ پورا کیا۔ مگر اتفاق سے ہاتھ پھیلانے میں گردن میں اتنا بے ضرورت خم پیدا ہوا کہ سر شانے سے مل گیا۔

بھلا میر صاحب کی نزاکت مزاج کب گوارا کرتی ہے زیر منبر ہی فرمایا یہ کاندھی دنیا کہاں سے سیکھا ہے۔

رمل اور مجتث یہ دونوں بحریں ٹھاٹ کے مصرع زیادہ نکالتی ہیں۔ ان بحروں نے متاخرین میں مرجعیت حاصل کی۔

میر نفیسؔ مرحوم نے عون ومحمد کے حال میں معرکۂ جنگ نظم کرتے ہوئے فوج کی پسپائی اور عون ومحمد کی فتحمندی کا ذکر دونوں کی گفتگو میں کیا ہے۔

چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے فوجوں کی کثرت پر ان کے فرار کا تذکرہ کر رہا ہے۔

اس جگہ چھپتے ہیں لاشوں کے جہاں تودے ہیں
امّاں سچ کہتی تھیں بھیّا کہ بڑے بودے ہیں

میر صاحب نے پہلے تو اس بیت کو بہت سیدھا سیدھا پڑھا، کلام کی خوبی نے مجلس کو بے چین کر دیا۔ اور اس کے بعد دوبارہ پڑھنے کی فرمائش پر:

اس جگہ چھپتے تھے لاشوں کے جہاں تودے ہیں

ہاتھ پھیلا کر مرثیہ کی اوٹ سے لاشوں کے تودے صورت کشی کرتے ہوئے دوسرا مصرعہ پڑھا۔

اماں سچ کہتی تھیں بھیّا۔ نرم اور طعنہ خیز آواز اور 'بڑے بودے ہیں' کو ماتھے پر شکن اور ہاتھوں کو پستی کی طرف جھٹک کر ادا کیا۔ مجلس اس انداز پر دوبارہ بے چین تھی، اس طرح کلام کا اثر دوہرا ہو جاتا ہے۔

سوزخوانی تحت اور آغاز مجلس میں ہوتی تھی۔ گویا بلند آواز سے راہ چلتوں کو آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ سازخوان تھا، اس لئے اس کو سوزخوان کہا گیا اور ساز کو مزاج اسلام کے لئے سازگار نہ سمجھا گیا۔ سوزخوانی کے بڑے بڑے اہل کمال ہندوستان میں پیدا ہوئے، اور انہوں نے تبلیغ عزاداری میں پورا حصہ لیا۔ گوالیار کی ریاست کی عزاداری کا آغاز ایک سوزخوان ہی سے ہوتا ہے جو مہاراجہ گوالیار کے یہاں گانے والوں میں ملازم تھا۔

مہاراجہ نے اس کی سوزخوانی سے حسینؑ کو پہچانا اور پھر امام حسینؑ کو شاید خود بھی عزاداری پھیلانی مقصود تھی، اس لئے چند در چند معجزے ہوتے گئے، آخر عزاداری گوالیار میں قائم ہوکر رہی۔

سوزخوانی کا موجد وہی تانسین تھا جو اکبری دربار کے نورتن میں شامل ہے۔ کیونکہ اسی کا نواسہ خوش حال خاں حیدرآباد کی ریاست میں منصور الدولہ کا ملازم تھا۔ یہی وہ خوش حال خاں ہے جس کی کمان (پھاٹک محراب دار) کوہ مولا (حیدرآباد) پر آج بھی موجود ہے۔ اور اسی کے قریب خستہ وشکستہ سا اس کا مزار ہے۔

اس کمان سے تھوڑے فاصلے پر ماہ لقا چند اس کی حسین وخوب صورت بیٹی ایک باغ میں محو آرام ہے جو خود بھی سوزخوانی میں مشہور تھی۔

اگر آپ حیدرآباد کی سوزخوانی سنیں گے جو یو۔ پی۔ کی سوزخوانی سے بالکل الگ اور مختلف ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ

جس نے سوزخوانی کو ساز سے الگ کیا ہے وہ کامل الفن شخص تھا۔

یو۔پی۔کی سوزخوانی کو یقیناً گانا نہیں کہا جاسکتا اور وہ امتیاز جو حیدرآبادی سوز میں ہے۔وہ یہاں یو۔پی۔میں کہیں نظر نہیں آتا۔

سوزخوانی ختم ہونے پر منبر پر پیش خوانی ہوتی تھی اس میں اصل ذاکر کا کوئی شاگرد یا عزیز، رباعی، سلام یا مرثیہ کے چند بند پڑھ کر اُتر آتا تھا۔اور مرثیہ خوان اس پیش خوانی سے مجلس کا ماحول معلوم کرلیتا تھا۔

سوزخوانی کے بعد مرثیہ خوانی کی باری ہے۔ہم نے ایسے بھی مرثیہ پڑھنے والے دیکھے ہیں جو بتانے کی کوشش میں منبر سے اُتر آتے تھے۔

اسی طرح دورآخر میں میر خورشید حسن عرف دولہا صاحب عروجؔ کے پڑھنے کا جواب نہ تھا۔

وہ بلندی پہ ستارا، کہ چمکتا ہے علم

اس انداز سے پڑھے کہ آدھی مجلس کھڑی ہوگئی۔

مرثیہ خوانی کے بعد نثرخوانی کا دور تھا۔یہ فن فارسی سے لیا گیا ہے، مگر پڑھنے کے انداز نے اس کو بھی ہندوستانی بنا دیا۔ نثرخوان منبر پر جا کر رباعی، قصیدہ اور متفرق اشعار سے اپنے کلام کا آغاز کرتا تھا۔اس کے بعد چہرہ شروع ہوتا تھا۔اس میں فارسی ادب کی تقلید کی جاتی تھی، پھر اردو تقریر مقفّیٰ و مسجع شروع ہوتی تھی، جیسا کہ اس عہد کا مذاق تھا، بچہ بچہ فارسی سے واقف تھا۔ فسانہ عجائب رجب علی بیگ سرور کی نثر اس نثر کا اعلیٰ نمونہ تھا۔

اس نثر کی خوبی کے ساتھ محل وموقع پر اشعار اور مرثیہ کے بند اس ٹھاٹ سے پڑھے جاتے تھے، کہ مجلس بے قرار ہوجاتی تھی۔

احمد حسین قمرؔ، منشی احمد حسین جاہؔ (مصنفین طلسم ہوش ربا) رام پور میں ملازم تھے۔ایسی ایسی مجلسیں پڑھیں کہ نواب عابد علی خاں مرحوم نے موتیوں سے منہ بھر دیا۔

ایک شخص مجلس میں بیٹھا کہ کیا مجال جو آنکھ سے آنسو نکلے۔اور ذاکر نے منبر پر دعویٰ کیا کہ آدمی تو کیا چیز ہے پتھر بھی تڑق کر یا حسینؑ کہے، جب مجلس پڑھ کر اترے تو یہ شخص روتے روتے بے ہوش ہوچکا تھا۔

آخری دور میں میر ولایت حسین صاحب ولاؔ مرحوم رام پور میں نثرخوانی کرتے تھے۔

نثرخوانی کے بعد روضہ خوانی تھی، اس میں اکثر ملا واعظ کاشفی کی روضۃ الشہداء فارسی یا اردو ترجمہ کے ساتھ پڑھتے تھے۔پھر کتاب خوانی ہوتی تھی، اور یہ گویا ہماری موجودہ ذاکری اور واعظی کے آغاز کی صورت تھی۔

اس میں بعض خوش الحان مختصر فضائل اور پھر مصائب لحن سے پڑھتے تھے۔

حضرت بحرالعلوم مولانا سید محمد حسین عرف علن صاحب قبلہ مجتہد اعلیٰ اللہ مقامہ نے ذاکری کے بیان کو اتنی وسعت دی کہ علوم وفنون بھی اس بیان میں شامل ہوگئے۔حضرت بحرالعلوم کے آخری زمانہ میں مولانا مقبول احمد صاحب مرحوم نے مناظرے کو عام کیا۔اسی کے ساتھ خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن مرحوم اور مولانا مولوی محمد رضا صاحب شمس آبادی اعلیٰ اللہ مقامہ نے اس فن واعظی کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

کتاب خوانی کے بعد واقعہ خوانی ہوتی تھی، ذاکر منبر پر لہجہ کے ساتھ واقعہ بیان کرتا تھا اور زیر منبر اسی کے ساتھی موجود ہوتے تھے۔ذاکر واقعہ بیان کرتے ہوئے ایک مصرع پڑھتا تھا۔زیر منبر بیٹھے ہوئے لوگ اس مصرع کو دہراتے تھے۔واقعہ کے بعد نوحہ خوانی ہوتی تھی، جو لکھنؤ میں ایک انجمن چک چکیوں پر کھڑے ہوکر نوحہ پڑھتی تھی۔

آخری زمانے میں چک چکی کی جگہ ہاتھ سے سینے پر ضرب لگائی جانے لگی اور اس انداز کا ماتم ہوگیا جو آج تک جاری ہے۔

ماتم یا نوحہ خوانی کے بعد پھر ترویح تھی، جس میں نظماً آئمہ معصومین کے واسطے سے اہل مجلس وبانی مجلس کے لئے دعا ہوتی تھی، آخر میں سورۂ فاتحہ پڑھوایا جاتا تھا۔اور مجلس عزا ختم ہوتی تھی۔

اب یہ تمام فنون ختم ہوچکے ہیں، صرف وعظ وماتم، سوزخوانی اور نوحہ خوانی باقی ہے۔جو اپنی تاریخی اور روایتی حیثیت سے جاری ہے۔

✿✿✿